کلیدی خطبہ
شبلی صدی بین الاقوامی سمینار

منعقدہ ۲۹-۳۰/نومبر-یکم دسمبر ۲۰۱۴ء

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے کہ ممکن ہے اس میں بعض لوگوں کو تضادات نظر آئیں، لیکن دراصل شخصیت کی یہ رنگارنگی اسے جاذبیت عطا کرتی ہے۔ وہ بیک وقت عالمِ دین تھے اور فنون لطیفہ کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ معقولات سے خاص دلچسپی تھی، اس لیے علم کلام کی طرف توجہ مبذول فرمائی۔ اسی بنا پر پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے انہیں سب سے پہلا متکلم قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی تاریخ وسوانح کے بھی دل دادہ تھے۔ راقم الحروف ان دونوں علوم کو ایک دوسرے سے جدا کر کے نہیں دیکھتا ہے۔ ان شعبوں میں ان کے فتوحات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کے حبیب صادق اور معتقد مہدی افادی نے تو یہ کہہ دیا تھا کہ وہ تاریخ کے بغیر دو قدم نہیں چل سکتے۔ یوں بھی ان کی شبیہ سب سے بڑھ کر ایک مورخ ہی کی رہی ہے۔ البتہ ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی کا ارشاد ہے کہ وہ تاریخ ہی کے راستے سے علم کلام تک پہنچے تھے کیونکہ ان کی تاریخی کتب بھی کلامیت سے خالی نہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی سب سے اچھی مثال ''الغزالی'' اور ''رومی'' ہیں۔ خطوط نویسی میں ان کا مقام بلاشبہ غالب کے بعد سب سے زیادہ بلند ہے۔ ان کے بعض خطوط میں ان کی انشاپردازی کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ اردو میں سفرنامہ لکھنے کی روایت ان سے پہلے سے موجود تھی لیکن ان کا سفرنامہ روم ومصر وشام اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ انھوں نے ان ممالک کو اس نظر سے دیکھا ہے کہ وہ اسلام کا دھڑکتا ہوا دل ہیں۔ اسلام

مدیر کانفرنس گزٹ، علی گڑھ۔

کے وہ شیدائی تھے، اس لیے اسلام اور مسلمانوں پر مستشرقین اور بعض دیگر مورخین کے بے بنیاد اعتراضات سے تڑپ اٹھتے اور ان کی علمی طور پر تردید کرتے۔ یہ درست ہے کہ اس معاملے میں انہوں نے بعض اہل علم کے نزدیک حدود سے تجاوز کیا ہے۔ اسی لیے بعض گوشوں سے اعتراض کیا جاتا ہے کہ تاریخ میں ان کا رویہ دفاعی تھا۔ خاکسار راقم الحروف کو اس سے بس جزوی اتفاق ہے۔ ''جزیہ'' اور ''کتب خانہ اسکندریہ'' ان کے ایسے معرکہ آرا مقالات ہیں جن کا اردو ہی میں نہیں، دوسری زبانوں میں بھی جواب نہیں ہے۔ بالخصوص جزیہ کے سلسلے میں ان کا یہ نکتہ کہ اسلامی حکومت میں جو غیر مسلم فوجی خدمت پر آمادہ ہوں ان سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے ایک بڑے اتّہام کی کیسی تسلی بخش تشریح ہے۔ الفاروق، المامون اور سیرۃ النبیؐ جلد اول اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کتابوں میں علامہ شبلی کا نقطۂ نظر حقیقت پسندانہ ہے یا دفاعی؟ اگر یہ اور اس قسم کی دوسری تصانیف ساتھ ساتھ رد الزام بھی کر دیتی ہیں تو یہ علامہ کی ذہانت کا کرشمہ ہے۔

یہاں ایک امر خاص طور سے قابل غور ہے۔ خلفائے راشدین میں انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ اور عباسی خلفاء میں مامون الرشید کا انتخاب کیوں کیا؟ من جملہ دیگر اوصاف کے حضرت عمرؓ کی قوت اجتہاد نہایت قوی تھی اور مامون الرشید نے مذاہب کے درمیان غیر جانب دارانہ موازنہ کی بنیاد رکھ کر آزادی فکر اور وسعت نظر کی بنیاد رکھی تھی۔

ان سب امور کے ساتھ علامہ کا حسن ذوق انہیں شاعری پر بھی مائل کرتا تھا اور انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ اردو میں ان کی شاعری کی نوعیت قومی اور ملّی ہے اور فارسی میں زیادہ تر عشقیہ۔ عشق نہ دماغ کا خلل ہے اور نہ اس سے ابتذال کو منسوب کرنا صحت مند ذہن کی علامت ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ فارسی شاعری ہندوستان میں غالب پر نہیں، علامہ شبلی پر ختم ہوئی۔ ممکن ہے اس قول میں کسی قدر مبالغہ ہو لیکن یہ امر مسلم ہے کہ ان کے ذوق شعری ہی نے ان سے شعرالعجم جیسی بلند پایہ کتاب لکھوائی۔ اس کتاب میں تحقیقی نقطۂ نظر سے جو بھی کمیاں ہوں، لاریب اس سے ہندوستان میں فارسی شعر و ادب کا احیاء ہوا اور بقول پروفیسر آصف نعیم صدیقی، صدر شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، شعرالعجم میں فارسی اشعار کا جیسا بے مثال انتخاب ہے ایسا کسی اور جگہ تلاش کرنا بے سود ہے۔ نیز یہ کہ اشعار کی تشریح

کا اتنا اعلیٰ معیار انہوں نے قائم کیا کہ اس کی پیروی بھی کوئی اور نہیں کر سکا۔

آگے بڑھنے سے پہلے پیچھے ہٹ کر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ علامہ شبلی کو جو کمالات حاصل ہوئے ان کا منبع اللہ کی دین کے علاوہ اور کہاں کہاں ہے۔ علامہ اعظم گڑھ کے مردم خیز علاقے کے ایک موضع بندول میں یکم جون ۱۸۵۷ء کو تولد ہوئے۔ وہ نسباً راجپوت تھے، ان کے دادا شیوراج سنگھ مسلمان ہو گئے تھے اور سراج الدین نام اختیار کر لیا تھا۔ ان کے والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا۔ وہ زمیں دار تھے۔ پیشہ وکالت تھا۔ شبلی کی ابتدائی تعلیم بندول ہی میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی درسگاہ مدرسہ ناصر العلوم تھا، پھر غازی پور بھیج دیے گئے۔ وہاں مدرسہ چشمۂ رحمت میں تعلیم حاصل کی اور پھر اعظم گڑھ واپس آ گئے اور مدرسہ علوم اسلامیہ میں داخلہ لے لیا۔ ان کے استادوں میں مولانا فاروق چریا کوٹی اور مولوی فیض اللہ قابل ذکر ہیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ بخششِ خداوندی کے بعد علامہ شبلی کی شخصیت کی تشکیل میں سب سے زیادہ مولانا فاروق چریا کوٹی کا ہاتھ ہے۔ معقولات کی طرف رجحان ہو یا فارسی شاعری کا ذوق یا موسیقی سے لگاؤ، یہ سب ان ہی کے لیے عطیات ہیں۔ استاد و شاگرد صبح کو سو کر اٹھتے ہیں۔ استاد (مولانا فاروق) سوال کرتے ہیں: شبلی، بھیرویں سنو گے؟ جس شاگرد کا استاد اسے علوم دینی اور منطق و کلام ہی کا درس نہیں دیتا ہے، صبح سویرے بھیرویں بھی سناتا ہے وہ شبلی نعمانی نہ بنتا تو اور کیا بنتا۔ اور پھر ایک مہذب اعلیٰ تعلیم یافتہ دوشیزہ کو موسیقی میں مہارت پیدا کرنے کا مشورہ نہ دیتا تو کیا کرتا۔

جب خورشید الاسلام نے کہا تھا کہ شبلی ہندوستان میں پہلے ''یونانی'' تھے تو غلط نہیں کہا تھا کیونکہ ان کی ذات میں ایک طرف یونان کی عقل و دانش اور منطق و فلسفہ اور دوسری طرف حسنِ شناسی اور ذوق لطیف کا اجتماع تھا اور ساتھ ہی وہ اسلام کے چشمۂ حیات سے سیراب ہوئے تھے۔ تب ہی تو جہاں انہوں نے علم کلام پر توجہ مبذول کی وہاں اردو میں خوب صورت خطوط لکھے اور فارسی میں جذبات انگیز شاعری کی۔ یونانی، چھینی اور ہتھوڑی سے پتھر کے حسین بت تراشتے تھے تو شبلی نے قلم سے دل نشین اور اثر آفریں الفاظ کا ذخیرہ مہیا کیا۔ ان کی فضیلت یہ بھی ہے کہ اسلام کے روئے تاباں کو اعداء کے ڈالے ہوئے گرد و غبار سے صاف کیا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ شبلی اکہری شخصیت نہیں رکھتے تھے بلکہ ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔

ابھی علامہ شبلی کے تحصیل علم کی داستان اعظم گڑھ اور غازی پور سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ ابھی تک ان پر مولانا فاروق چریا کوٹی کے اثرات کا ذکر ہوا ہے۔ انہوں نے پہلے رام پور جا کر مولانا ارشاد حسین مجددی رام پوری سے فقہ اور اصول فقہ کی تحصیل کی اور پھر لاہور جا کر مولانا فیض الحسن سہارن پوری سے ادب کا درس لیا اور جب وہ سہارن پور منتقل ہو گئے تو شبلی بھی ان کے ساتھ وہاں چلے گئے۔ بعد ازاں وہ مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کے درس میں شریک ہو گئے جہاں انہوں نے صحاح ستہ کی معروف و مستند کتاب جامع ترمذی کا درس لیا۔

علامہ شبلی کے خاندان میں وکالت کا پیشہ مقبول تھا، اس لیے انہیں بھی اسی راستے پر ڈالنے کی کوشش کی گئی لیکن اس پیشے کی خشکی ان کے تر و تازہ دماغ کو راس نہ آئی۔ انہیں تو قدرت نے اہم تر کاموں کے لیے منتخب فرمایا تھا اور وہ کام انہوں نے مختلف طریقوں سے انجام دیے اور ایسے انجام دیے کہ ان کی صد سالہ برسی آج اس اہتمام سے منائی جا رہی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کی کارکردگی کے مرکز چار رہے ہیں۔ علی گڑھ، حیدر آباد، ندوۃ العلماء (لکھنؤ) اور وطن مالوف اعظم گڑھ۔ وہ ۱۸۸۳ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل (ایم-اے-او) کالج میں فارسی و عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۶ سال سے بھی کم تھی۔ اس سے پہلے وہ علی گڑھ ۱۸۸۱ء میں آئے تھے اور انہوں نے علی گڑھ کے پیر جواں مرد سر سید احمد خاں (جو ان سے عمر میں چالیس برس بڑے تھے) کی شان میں عربی میں قصیدہ پیش کیا۔ اس مرد پیر نے جوان العمر شبلی کی صلاحیت کو دوسری آمد (۱۸۸۳ء) میں کے موقع پر پرکھا اور اپنا عظیم الشان کتب خانہ ان کے حوالے کر دیا کہ اس سے جی بھر کر استفادہ کریں۔ شبلی نے علی گڑھ میں ۱۵ سال گزارے۔ علی گڑھ سے ان کا معاملہ سیکھنے اور سکھانے کا رہا۔ ایم-اے-او کالج کے قیام سے سر سید کا اولین مقصد مسلمانوں میں انگریزی زبان کے ذریعہ جدید علوم کا حصول تھا تا کہ ان میں روشن خیالی پیدا ہو اور وہ مصاف حیات میں تیز گام ہو جائیں لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ جو کچھ حاصل کریں مسلمان رہ کر حاصل کریں اور اس غرض سے انہوں نے اپنی درس گاہ میں جدید علوم کے ساتھ عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم کا بھی معقول انتظام کیا تھا۔ مولانا شبلی علی گڑھ میں رہ کر اپنے ذہنی افق کو وسیع تر کرتے رہے اور دوسری طرف کوشش کرتے رہے کہ علی گڑھ میں

صحیح اسلامی ماحول کی نشو ونما ہو۔ وہ عربی کے استاد تھے، اس لیے ان کی خواہش تھی کہ جو طالب علم عربی پڑھتے ہیں وہ کتابی علم سے واقف ہونے کے ساتھ عربی بولنے اور لکھنے کی صلاحیت بھی اپنے اندر پیدا کریں، اس غرض سے انہوں نے لجنۃ الادب کی تاسیس فرمائی۔ علی گڑھ میں پروفیسر آرنلڈ کی صحبت دونوں کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ علامہ کی متعدد اعلیٰ درجے کی تصانیف علی گڑھ کے دوران قیام میں شائع ہوئیں۔ یہ تصانیف انہوں نے علی گڑھ کی نذر کر کے اس کے علمی خزانے میں گراں بہا اضافہ کیا اور مالی اعتبار سے بھی فائدہ پہنچایا۔ ان سے زیادہ کون جان سکتا تھا کہ قرآن مجید مسلمانوں کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنی جسم کے لیے روح بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ روح تو بالآخر ایک دن جسم سے جدا ہو جاتی ہے، قرآن مجید اس دنیا اور اس دنیا دونوں میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ چنانچہ انہوں نے کالج میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا جو بہت مقبول ہوا۔ یہاں یہ عرض کرنا بے جا نہیں ہوگا کہ کالج کے مسلم یونیورسٹی بن جانے کے بعد یہی خدمت صدر شعبہ سنی دینیات مولانا سید سلیمان اشرف انجام دیتے رہے۔ ان کے جانشین مولانا مفتی عبداللطیف بڑے حلقے میں تو درسِ قرآن نہیں دیتے تھے لیکن چند منتخب طالب علموں کو مستفیض فرماتے تھے۔ ان کی قرآن فہمی اپنے وقت میں بے مثال تھی۔

علی گڑھ کا ایک اور ادارہ جس کے بانی سرسید ہی تھے علامہ شبلی کے فیوض سے بہرہ ور ہوا۔ یہ ادارہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہے جس کے سالانہ اجلاس متحدہ ہندوستان کے طول وعرض میں منعقد ہوتے تھے۔ ان اجلاسوں کی افادیت میں علامہ شبلی کے خطبات اور نظموں نے بدرجہا اضافہ کر دیا تھا اور کانفرنس میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔

سرسید سے علامہ شبلی کے اختلافات کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے۔ پروفیسر شان محمد نے اپنے مضمون مطبوعہ ماہ نامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، بابت اکتوبر ۲۰۱۴ء میں لکھا ہے کہ بعض معاملات میں سرسید سے ان کے قریب ترین رفقاء کو بھی اختلافات تھے۔ مولوی سمیع اللہ خاں کا اختلاف اتنا شدید تھا کہ انہوں نے سرسید کی وفات کے نو برس قبل سے ان سے ملاقات نہیں کی تھی۔ اس میں استثناء حالی، محسن الملک اور وقار الملک کا بھی نہیں تھا۔ فرق بس اتنا تھا کہ نواب وقار الملک بعض اوقات شدید زبان بھی اختیار کر لیتے تھے اور نواب محسن الملک اور حالی سرسید کے عزو وقار کو

ہمیشہ ملحوظ نظر رکھتے تھے۔ اختلاف کے بڑے سبب دو تھے۔ کالج میں انگلش اسٹاف کا بڑھتا ہوا رسوخ اور سید محمود کی بد دماغی اور انگلش اسٹاف کے ساتھ ان کا تال میل۔ پروفیسر شان محمد نے یہاں تک لکھا ہے کہ کہا جاتا تھا کہ یہ انگلش اسٹاف در پردہ مسلمان طلبہ کو عیسائی بنانے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ علامہ شبلی کے معاملے میں اختلاف کے دو اضافی سبب بھی ہو سکتے تھے۔ دونوں کی سیاسی سوچ کا فرق اور علامہ کے نزدیک کالج میں صحیح دینی فضا کی کمی۔ سرسید ایک ایسا ادارہ چلا رہے تھے جس کے لیے ان کے پیش نظر آکسفورڈ اور کیمبرج کا معیار تھا، اسے چلانے اور ترقی دینے کے لیے ان کی رائے میں انگلش اسٹاف کی موجودگی اور حکومت وقت کا تعاون ضروری تھا۔ خود علامہ شبلی کو ندوۃ العلماء میں پہنچ کر حکومت سے سمجھوتہ کرنا پڑا تھا۔ تاہم ہمارا خیال ہے کہ علامہ شبلی بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ اس معاملے میں حدود سے تجاوز کیا جا رہا ہے۔ وہ ۱۸۹۰ء کی دہے کے آغاز سے ذہنی طور پر علی گڑھ سے دور ہوتے گئے، پھر بھی سرسید کی زندگی میں رسمی لحاظ سے علی گڑھ سے وابستہ رہے۔ ۱۸۹۸ء میں ان کی وفات کے بعد وہ علی گڑھ رہنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اس کا سبب سید محمود کی نخوت کے علاوہ علامہ شبلی کی یہ دور اندیشی بھی ہو سکتی ہے کہ سرسید کے جانشین ان کی جیسی ذہنی رفعت اور روشن خیالی سے عاری ہیں۔ وہ ان کی سیاسی پالیسی پر تو چلیں گے لیکن تعلیمی اور سماجی امور میں ان کی پیروی نہیں کر سکیں گے۔ ہوا بھی یہی، ۱۸۹۸ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان علی گڑھ کی سیاست تو وہی رہی جس کی بنیاد سرسید نے رکھی تھی لیکن ان کے علمی مقاصد وہ پورے نہ کر سکا اور ان کی ذہنی بالیدگی اور وسیع النظری میں وہ بچھڑ گیا۔ اس میں واحد استثناء سرسید کے پوتے سر راس مسعود کا ہے جنہوں نے اپنے مسلم یونیورسٹی کے دور وائس چانسلری (۱۹۲۹-۱۹۳۴ء) میں اپنے دادا کی یاد تازہ کر دی تھی۔

علی گڑھ سے جانے کے بعد علامہ شبلی نے کچھ وقت ندوۃ العلماء لکھنؤ اور وطن مالوف اعظم گڑھ میں گزارا۔ سلسلۂ تصنیف و تالیف اس وقت بھی جاری رہا۔ ۱۹۰۱ء میں وہ حیدر آباد پہنچ گئے اور ۱۹۰۵ء تک مقیم رہے۔ وہاں ان کے مشاغل کا دائرہ وسیع رہا، عملی اعتبار سے بھی اور تصنیف و تالیف کے لحاظ سے بھی۔ وہاں انہیں امور مذہبی کی نیابت کی پیش کش ہوئی جو انہوں نے کسی وجہ سے قبول نہیں کی۔ بالآخر ان کا تقرر سررشتۂ تعلیم کے ناظم کی حیثیت سے ہو گیا، لیکن ریاستی سیاست

کے نشیب وفراز کی بنا پر یہ اِدارہ استقامت حاصل نہیں کر سکا۔ تاہم حیدرآباد میں رہ کر انہوں نے دوسروں کی تصانیف تو شائع کیں ہی، خود الغزالی، علم الکلام، الکلام اور موازنہ انیس و دبیر جیسی بلند پایہ کتابیں لکھیں اور چھپوائیں۔ انہیں تصنیفی کاموں کے لیے ریاست سے جو وظیفہ ملتا تھا اس کی وجہ سے یہ کتابیں سلسلہ آصفیہ میں شامل ہوئیں۔

وہ جہاں بھی رہے مدارس کے نصاب تعلیم میں اصلاح وتبدیلی کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہے اور اس مقصد کے لیے ان کی نظر ہمیشہ ندوۃ العلماء پر مرکوز رہی۔ اس کے اجلاسوں میں شرکت کرتے اور تجاویز پیش فرماتے رہے۔ بالآخر ۱۹۰۵ء میں وہاں آ گئے اور اس کے معتمد تعلیم مقرر ہو گئے۔ وہ ۱۹۱۲ء تک اس عہدے پر سرفراز رہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا علامہ شبلی کی دلچسپی اور توجہ کا اصلی مرکز نصاب تعلیم میں تبدیلی کا مسئلہ تھا۔ وہ جملہ فنون آلیہ وعالیہ میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ مدارس میں بالعموم علوم آلیہ (یعنی صرف ونحو) اور معقولات کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی اور ان علوم میں بھی جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں وہ اب وقت کا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہ گئی تھیں۔ علامہ ان میں تبدیلی تو چاہتے ہی تھے، ان کا اصلی مقصد یہ تھا کہ علوم عالیہ (تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ اور اصول فقہ) اور ادب وانشاء پر خاص طور سے توجہ مبذول کی جائے۔ اور پھر مسئلہ تھا انگریزی کی تعلیم کا بلکہ علامہ کی نگہ دوررس تو سنسکرت کی تعلیم تک پہنچی ہوئی تھی۔ علامہ ندوۃ العلماء میں رہے تو یہی لڑائی لڑتے رہے۔ ان کی بعض باتیں مانی گئیں، زیادہ تر نہیں مانی گئیں۔

دیگر دینی وعربی درس گاہوں کے مقابلے میں بالخصوص ادب وانشاء اور جدید عربی کے معاملے میں جو امتیاز ندوۃ العلماء کو حاصل ہے اس میں بلاشبہ علامہ کی ابتدائی دور کی جدوجہد کو بہت دخل ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی رائے ہے کہ اس کا مقصد تبلیغی تھا یعنی مستشرقین نے انگریزی میں اسلام اور مسلمانوں پر جو اعتراضات کیے ہیں ان کی جواب دہی، لیکن راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ واحد مقصد نہیں ہوسکتا تھا۔ ان زبانوں میں جو علمی خزانے موجود تھے علامہ شبلی مدارس کے طلبہ پر ان کا انکشاف چاہتے تھے۔ ''اچھائی جہاں ملے اسے اختیار کرو'' پر ان کا گہرا عقیدہ تھا۔ خاکسار راقم الحروف کی رائے ہے کہ ہمارے اکابر کو اکثر ایسے رنگ میں پیش کیا جاتا

ہے جوان کا اصلی رنگ نہیں ہوتا ہے۔ علامہ شبلی کے ساتھ یہ شاید سب سے زیادہ ہوا ہے۔ وہ عالم دین تھے لہٰذا انہیں بیشتر لوگ اسی رنگ میں رنگا ہوا دیکھنا چاہتے تھے جو ہم نے بالعموم علماء کے لیے اپنے ذہنوں میں تجویز کرلیا ہے اور جب دیکھتے ہیں کہ علامہ شبلی کا رنگ اس سے مختلف ہے تو ان کے مخالفین ان پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں اور معتقدین ان کے اصلی رنگ کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں یا پھر ان کی ایسی تاویلیں کرتے ہیں کہ علامہ کی تصویر بے رنگ ہوجائے۔ کوئی انہیں سرسید کا حریف بنا کر پیش کرتا ہے، کوئی ندوۃ العلماء میں ان کے اور دیگر علماء کے علمی یا نظریاتی اختلافات کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ ان کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگ گئی ہے، کوئی ان تصانیف کا واحد مقصد مستشرقین کی جواب دہی قرار دیتا ہے، کوئی ان میں تقویٰ کی کمی محسوس کرتا ہے اور بعض تو کھلم کھلا ان کی کردار کشی کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری رائے میں یہ نتیجہ ہے مکمل شخصیت کے بجائے آدھی ادھوری شخصیت کو نگاہ میں رکھ کر فیصلے سنا دینے کا۔

علامہ شبلی نعمانی کا ندوۃ العلماء میں رہ کر اصلاح نصاب کی کوشش کے علاوہ دوسرا بڑا کام رسالہ الندوہ کی ادارت تھا۔ اس کی ادارت میں وقتاً فوقتاً ان کے شریک کار متعدد اہل علم رہے لیکن ادارت کی اصلی ذمہ داری ان ہی کے سر رہی۔ اس رسالے نے اس دور میں جو شہرت و امتیاز حاصل کیا بعد میں اگر اس کا مثل بنا تو ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی کی ادارت میں نکلنے والا معارف۔ معارف بھی اب اپنی زندگی کی پہلی صدی ختم کرنے کے قریب ہے لیکن الحمدللہ پابندی وقت کے ساتھ نکل رہا ہے اور بڑی حد تک اپنے معیار کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے ندوۃ العلماء کی ترقی کے لیے گوناگوں خدمات انجام دیں لیکن وہاں کے قدیم الخیال بزرگوں سے ان کا نباہ نہیں ہوسکا اور ۱۹۱۲ء میں انہی اسے چھوڑنا پڑا۔ ''جدید'' اور ''قدیم'' دونوں سے بددل ہوکر انہوں نے خود اپنے نگر میں اپنی بستی بسانے کا اہتمام کیا اور آج اسی بستی میں ان کی صدسالہ وفات کی تقریب منعقد ہورہی ہے۔

علامہ شبلی کی تصانیف کا دائرہ علی گڑھ تا حیدرآباد تا لکھنؤ وسیع ہے اور انہوں نے، جیسا کہ عرض کیا گیا، مختلف علوم وفنون پر قلم اٹھایا ہے اور ان کا حق ادا کیا ہے۔ یہ امر مختلف فیہ رہا ہے کہ ان کا اصلی کارنامہ علم کے کس شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ علامہ کے دوست اور معتقد مہدی افادی کا کہنا

تھا کہ ان کا اصلی موضوع تاریخ ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا ارشاد ہے کہ وہ تاریخ کے ذریعہ علم کلام تک پہنچے کیونکہ ان کی تاریخی تصانیف میں بھی علم کلام کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ اس اعتبار سے درست ہے کہ علم الکلام اور الکلام کے علاوہ الغزالی اور رومی میں بھی کلامی مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی کی رائے ہے کہ علامہ اصلاً متکلم ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہو، ان کی انشا پردازی ہر جگہ نمایاں ہے۔ انشا پردازی کا اصلی جوہر تو بعض خطوط میں کھلتا ہے لیکن ان کی آخری تصنیف سیرۃ النبیؐ جلد اول میں بھی انشا کے اعلیٰ نمونے نظر افروز ہوتے ہیں۔ ظہور قدسی پر انہوں نے جس طرح روشنی ڈالی ہے متعدد اہل نظر کے نزدیک وہ ان کی انشا پردازی کا شاہکار ہے اور اردو ادب میں اس کی مثال ملنا دشوار ہے۔

علامہ شبلی جہاں رہے فرائض منصبی ادا کرنے کے علاوہ مختلف طریقوں سے علم و ادب کی آب یاری کرتے رہے اور تصنیفات و تالیفات سے وہاں کے علمی و ادبی خزانوں میں اضافہ کیا۔ علی گڑھ کے دوران قیام مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر رسالہ لکھا۔ یہ دراصل آل انڈیا محمڈن (اب مسلم) ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک سالانہ اجلاس کے لیے لکھا ہوا ان کا خطبہ ہے۔ علامہ کی دوسری تصنیف المامون تھی۔ یہاں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت قائم رکھی۔ عوام اور خواص دونوں طبقے ہارون الرشید کے نام سے زیادہ واقف تھے۔ اس کے گرد مختلف قصے مشہور تھے۔ اس کی علم دوستی اور علماء نوازی، اس کی شان و شوکت اور داد و دہش نے ان قصوں کو جنم دیا تھا۔ راقم الحروف کی رائے میں سوانح لکھنے کے لیے علامہ شبلی نے مامون الرشید کا انتخاب اس لیے کیا کہ اس کی علم کی جستجو اور حق تک رسائی کے لیے اس کی کاوش انھیں بھا گئی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ اس کی تصنیف کا باعث ہارون الرشید پر پامر کی تصنیف ہے جس میں اس نے ''اسلام کے خلاف زہر افشانی'' کی تھی۔ دراصل علامہ شبلی کے بیشتر معتقدین و مداحین نے انہیں اسی رنگ میں پیش کیا ہے کہ وہ ہاتھ میں قلم پکڑے ہوئے مستشرقین کی تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔ جہاں کسی مستشرق کی یا وہ گوئی پر نظر پڑی جواب لکھنے کے لیے قلم سنبھال لیا۔ گویا علامہ شبلی کا قلم نہ ہوا سودا کا قلم دان ہو گیا۔ اسی قسم کے اظہار خیال نے بعض جدید تعلیم یافتہ حضرات کو موقع فراہم کیا ہے کہ وہ علامہ کی تاریخ نویسی کو دفاعی قرار دیں۔ علامہ کو مامون کی تلاش حق پسند آئی اور انہوں نے اس کی سوانح

لکھنے کا قصد کرلیا۔ اب اگر اس میں پامر کے الزامات کا جواب بھی آ گیا تو اس کا ایک مزید وصف ہوا۔ اسے اس کی تصنیف کا اصلی سبب قرار دینا کیا ضروری ہے۔ علامہ کی تیسری تصنیف سیرۃ النعمان (سوانح امام ابوحنیفہؒ) ہے جس نے انہیں محمد شبلی سے شبلی نعمانی بنا دیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا ارشاد ہے کہ انہیں یہ لقب ان کے استاد محترم مولانا فاروق چریا کوٹی نے عطا کیا تھا۔ علامہ نے یہ لقب خود اختیار کیا ہو یا ان کے استاد کا عطیہ ہو، اس کا سبب بہر حال علامہ شبلی اور ان کے فاضل استاد مولانا چریا کوٹی کا امام اعظم کے تفقہ فی الدین کو قرار دیا جا سکتا ہے یعنی مسائل میں جتنی وسیع امام اعظم کی نظر تھی اور جیسا درک انھیں مسئلے کی تہہ تک پہنچ جانے کا حاصل تھا اس کی نظیر اور کسی فقیہ کے وہاں ملنا مشکل ہے۔

علامہ شبلی اپنے ترکی کے سفر پر علی گڑھ ہی کے دوران قیام میں ۱۸۹۲ء تشریف لے گئے۔ اس کا مقصد علم کی پیاس بجھانا تھا۔ ہمیں حکم ہے **اطلبوا العلم ولو کان بالصین**۔ یہاں صین (چین) استعارہ ہے دور دراز مقامات سے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا کہنا ہے کہ وہ الفاروق لکھنے کے لیے بے تاب تھے اور ان کا اصلی مقصد اس کے لیے مواد جمع کرنا تھا جہاں بھی دستیاب ہو۔ قسطنطنیہ کا کتب خانہ کل ہی نہیں، آج بھی علم کا بڑا ذخیرہ ہے اور قدیم تاریخ اور مخطوطات پر کام کرنے کے لیے آج بھی اس ذخیرے سے اہل علم مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس وقت اس مقصد سے شدر حال کرنا پڑتا تھا اور آج سائنسی ایجادات کی بدولت گھر بیٹھے یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ تاہم سفر کی اپنی برکات ہیں اور قرآن مجید میں بھی عبرت و موعظت کی خاطر **سیروا فی الأرض** کا حکم ملتا ہے۔ سید صاحب کی یہ رائے بھی ہے کہ اس سفر کی ایک غایت بحالیِ صحت بھی تھی۔ ہمیں اس سفر کی تفصیلات سے بحث نہیں ہے۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس سے ہمارے ہاتھ کیا لگا۔ علامہ کو ضمنی فوائد بھی پہنچے، مثلاً انھوں نے کسی قدر ترکی زبان سیکھ لی۔ وہاں کے طرز تعلیم کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔ مولانا ندوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایم-اے-او کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا معروف روزگار یونیفارم (ترکی ٹوپی اور ترکی کوٹ) سر سید احمد خاں نے علامہ شبلی ہی کی رائے کے مطابق اختیار کیا تھا اور یہ ثمر تھا علامہ کے سفر قسطنطنیہ کا۔ وہاں رہ کر اور وہاں کے مناظر سے انسپی ریشن (Inspiration) حاصل کر کے علامہ کی فارسی شاعری کو بھی

چار چاند لگ گئے، ترکی حکومت نے انہیں اپنے ایک بڑے اعزاز تمغۂ مجیدیہ سے سرفراز کیا۔

علامہ شبلی کو ترکی سے تو تمغۂ مجیدیہ مل ہی گیا تھا، سرسید نے سوچا ہوگا کہ برطانیہ کے اعزاز شمس العلماء سے بھی سرفراز ہو جائیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ''حیات شبلی'' میں اس کا ایک سبب یہ بھی لکھا ہے کہ ترکی جانے، ''خلیفہ'' سے ملنے اور تمغۂ مجیدیہ سے سرفراز ہونے کے بہ سبب وہ برطانیہ کے حکام کی نظر میں مشکوک ہو گئے تھے۔ سرسید نے ان کا شک رفع کرنے اور علامہ کی وفاداری کا یقین دلانے کی غرض سے یہ کوشش کی تھی۔ بہر حال علامہ شبلی شمس العلماء بھی ہو گئے حال آں کہ اس سے پہلے بھی وہ کسی نیر تاباں سے کیا کم تھے۔

اب علامہ شبلی کا دل علی گڑھ سے اچٹ گیا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ترکوں کی جنگ میں فتح کا جو جشن علی گڑھ میں منایا گیا اس میں علامہ شبلی نے تو دلچسپی لی لیکن سرسید نے اسے پسند نہیں کیا۔ اس دوران علامہ کسی نہ کسی طرح نبھاتے رہے لیکن جب دو، تین سفر حیدر آباد کے ہوئے تو وہاں انہیں اپنی دلچسپی کا سامان نظر آیا۔ انہوں نے دائرۃ المعارف کی کارکردگی کو بہتر بنانے کی بعض تجاویز پیش کیں جس کا اچھا اثر ہوا۔ آصف جاہ سادس میر عثمان علی خاں نے ایک سو روپے ماہوار تعلیمی وظیفہ مقرر کر دیا جس میں بعد میں آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں نے اتنا ہی اضافہ کر دیا۔

اس دوران علامہ شبلی الفاورق کی تصنیف میں سرگرداں رہے۔ جہاں جو مواد میسر آیا جمع کیا۔ یہاں تک کہ بعض نئی کتابوں کی اشاعت کا انتظار بھی کیا۔ اس کی تالیف میں چار برس صرف ہوئے اور جب وہ ۱۸۹۸ء میں شائع ہو کر آئی تو علامہ شبلی کا شاہ کار قرار پائی۔ اس کتاب کی تالیف، مولانا سید سلیمان ندوی کی روایت کے مطابق، تین مقامات پر ہوئی: علی گڑھ، اعظم گڑھ اور کشمیر۔ وہ اختتام کو کشمیر میں پہنچی۔ کون جانے اس کے حسن و طراوت میں کشمیر کا بھی حصہ نہیں ہے۔ یہ وہی سال ہے جب علامہ کا علی گڑھ سے تعلق منقطع ہوا۔ اس لیے علی گڑھ کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ علامہ کی کم از کم چار تصانیف میں حصہ دار ہے اگرچہ الفاروق طبع کان پور میں ہوئی ہے۔ حضرت عمرؓ فاروق کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے خطابت، فراست، شجاعت، نظم و نسق کی صلاحیت جیسے اوصاف بیک وقت جمع فرما دیے تھے۔ ان کی قوت اجتہاد صدر اسلام میں بھی بے نظیر تھی۔ اس کا مطلب یہ

ہے کہ اس وقت جب صحابۂ کرامؓ بڑی تعداد میں موجود تھے، ابھی نبی کریمؐ کو دنیا سے تشریف لے جائے ہوئے زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی اجتہاد کی ضرورت پیش آ جاتی تھی اور اس ضرورت کو بالعموم حضرت فاروقؓ پورا فرماتے تھے۔ ایسی ذات گرامی کے سوانح لکھنے کے لیے شبلی ہی کا قلم درکار تھا اور انہوں نے اس کا حق پورا پورا ادا کیا ہے۔

اگر چہ حیدر آباد میں علامہ شبلی کا قیام مختصر رہا لیکن وہ ہمارے لیے اس پناپر اہم ہے کہ اس دوران الغزالی، علم الکلام، الکلام، سوانح مولانائے روم اور موازنہ انیس و دبیر جیسی بیش بہا تصانیف وجود میں آئیں۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ علامہ شبلی کی علمی و ادبی حیثیت کے بارے میں شبلی شناسوں میں اختلاف رہا ہے۔ خاکسار راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ ان کی شخصیت کا اصلی کمال یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ اور علم کلام کو کس طرح باہم پیوست کیا ہے۔ اس کی بہترین مثال الغزالی ہے جو علم الکلام اور الکلام سے پہلے لکھی گئی ہے۔ امام غزالی متکلم تھے، اس لیے ان کے سوانح میں ان کی کلامی حیثیت پر گفتگو ناگزیر تھی۔ یہ تصنیف اور اس کے بعد کی تصانیف ماسوا سیرۃ النبیؐ کے قیام حیدر آباد کی یادگار ہیں۔ علامہ شبلی سے الغزالی کے لکھنے کی فرمائش سب سے پہلے سرسید احمد خاں نے کی تھی لیکن سوال یہ ہے کہ انہوں نے یہ فرمائش کیوں کی تھی؟ ہمارا خیال ہے کہ اس کا سبب خود سرسید کا علم کلام سے ذوق ہو سکتا ہے۔ اگر ان کی پوری مذہبی فکر کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ خود بھی متکلم ہی تھے۔ علم کلام ہے کیا؟ اسلامی فکر اور اپنے دور کی رائج فکر میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش۔ امام غزالی کا واسطہ یونانی فلسفے سے رہا تھا اور سرسید اور علامہ شبلی کا مغربی سائنس سے۔ اس لیے ان سب نے اپنے اپنے دور میں اپنے اپنے طور پر فلسفہ، سائنس اور مذہب میں رشتے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ علامہ شبلی عالم دین تھے اور پھر علی گڑھ میں رہ کر علوم جدیدہ سے بھی کسی قدر واقفیت حاصل کر لی تھی۔ یہ بات پہلے بیان ہوئی ہے کہ ان کی شخصیت یک رخی نہیں تھی۔ انہیں علوم عقلیہ و نقلیہ سے یکساں دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس مرحلے پر انہوں نے علم کلام کی طرف توجہ مبذول کی۔ اس وقت انہیں سرسید کی فرمائش یاد آئی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے اس کام کا آغاز امام غزالی سے کیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ اچھی بات لکھی ہے کہ جس طرح امام غزالی زندگی کے مختلف نشیب وفراز اور علم کے گوناگوں مراحل سے گزر کر علم کلام تک پہنچے تھے اسی طرح یہ کتاب (الغزالی) ان کی زندگی کے مختلف احوال وکوائف بیان کرنے کے بعد اپنے اصلی موضوع (علم کلام) اور امام غزالی کی متکلمانہ حیثیت پر اظہارِ خیال کرتی ہے۔

بقول سید صاحب جب وہ علم الکلام تصنیف کر رہے تھے اسی وقت سے الکلام کا مواد جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس دوران انہوں نے دو ایک مضمون بھی لکھے تھے جن کا موضوع امام غزالی اور علم کلام تھا۔ اگر علم الکلام قدیم فلسفۂ کلام سے بحث کرتی ہے تو بقول خود ان کے الکلام اس کے جدید رخ سے۔ لیکن یہ جدید بھی آج کا قدیم ہی تھا۔ ایک بات اور ملحوظ نظر رہنی چاہیے اور وہ ہے معتزلہ سے علامہ کا شغف۔ اس موضوع پر ان کے دو ایک مضمون پہلے ہی شائع ہو چکے تھے۔ یہ تینوں کتابیں تقریباً ساتھ ساتھ چلتی رہیں اور آگے پیچھے شائع ہوئیں یعنی بیسویں صدی کے آغاز میں۔ اس وقت علامہ کی عمر ۴۵ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ دوران کے علوم عقلیہ سے شغف کا دور ہے۔ اس کا آغاز تو علی گڑھ ہی میں ہو گیا تھا، تکمیل قیام حیدرآباد کے دوران ہوئی۔ اگرچہ دونوں مقامات پر وہ بعض ذہنی الجھنوں میں مبتلا رہے۔

سوانح مولانائے روم کی طرف بھی وہ اسی لیے راغب ہوئے کہ وہ بظاہر ایک بڑے صوفی تھے لیکن علم کلام کا ذوق بھی انہیں ودیعت ہوا تھا اور ان کی مثنوی بھی اس سے خالی نہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ مولانائے روم کے ایک بڑے شاعر ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا ہے اور علامہ شبلی کا فارسی شاعری سے شغف معلوم ومعروف ہے۔ اس لیے انہیں مثنوی میں تصوف، کلام اور شاعری کے اعلیٰ نمونے یک جا نظر آئے اور اسی لیے وہ مثنوی اور صاحب مثنوی پر لکھنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کتاب کا مطالعہ اس نیت سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس سے علامہ شبلی کی تنقیدی صلاحیت پر وافر روشنی پڑتی ہے۔

اس کتاب کی نگارش کا آغاز حیدرآباد میں ہو گیا تھا اور وہ منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع سے چھپ کر ۱۹۰۴ء میں اس وقت آئی جب وہ حیدرآباد سے ندوۃ العلماء لکھنؤ آ گئے تھے۔ حیات شبلی واوین کے استعمال سے خالی ہے، اس لیے یہ معلوم کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ کون سی

عبارت مصنف محترم کی ہے اور کون سی کسی دوسرے اہل قلم کا اقتباس ہے۔ تاہم درج ذیل عبارت چاہے سید صاحب کی ہو یا مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی ہے مبنی برحقیقت ''مبارک تھا وہ وقت جب ان (علامہ) کی توجہ تصوف کی طرف مائل ہوئی کیونکہ اسی توجہ کا بیش بہا نتیجہ وہ تصنیف (سوانح مولانائے روم) ہے جس پر ہم یہ ریویو لکھ رہے ہیں ...صرف ایک تصوف کی کتاب کی حیثیت سے یہ دقیقہ سنجی علامہ شبلی کی نظر کے واسطے ودیعت تھی کہ مثنوی معنوی علم کلام کا بھی بہترین مجموعہ ہے''۔ گمان غالب ہے کہ یہ عبارت مولانا شروانی کے تبصرے کا حصہ ہے کیونکہ بعد میں سید صاحب نے مزید تشریح کی ہے کہ جس طرح عقلیات کی تلاش نے مولانا (شبلی) کو اِمام غزالی کی درس گاہ تک پہنچایا۔ امام غزالی کی تلاش ان کو مولانا روم کے آستانے پر لے آئی۔ گویا سید صاحب کا جو قول ہم نے پہلے کہیں نقل کیا ہے کہ علامہ تاریخ کے ذریعہ علم کلام تک پہنچے (اور پھر اس میں تصوف بھی شامل ہو گیا) برحق ہے۔

موازنہ انیس و دبیر کا آغاز تو سوانح مولانائے روم سے پیشتر ہو گیا تھا لیکن وہ شائع ہوئی اس کے بعد۔ موازنہ کے بعد شعرالعجم لکھی گئی۔ اس کی بابت راقم الحروف کسی قدر اظہار خیال کر چکا ہے۔ یہاں یہ عرض کرتا ہے کہ علامہ کی ادبی تنقید کا نمونہ یہی دونوں کتابیں ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ شعرالعجم میں تنقید کے ساتھ فارسی شاعری کی تاریخ بھی آ گئی ہے۔ موازنہ میں علامہ نے میر انیس کو مرزا دبیر پر ترجیح دی ہے اور یہ ترجیح بالکل درست ہے کیونکہ انیس کے وہاں جو خیال بندی ہے اور الفاظ کے استعمال پر جیسی قدرت انھیں حاصل ہے دبیر وہاں تک نہیں پہنچے۔ تاہم انیس کا نقص یہ ہے کہ انھوں نے عراق کے ذکر میں شمالی ہند کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

حیدرآباد میں علامہ نے جو دوسرے کارنامے انجام دیے ان کے اظہار کا یہ موقع نہیں، بہرحال ریاست کی سیاست سے علامہ کا خوگر ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ۱۹۰۵ء کے آغاز میں وہ حیدرآباد کی ملازمت سے مستعفی ہو کر وہاں سے چلے آئے۔

علامہ شبلی نعمانی کی خدمات کا دائرہ وسیع ہے۔ ان میں مختلف انجمنیں اور ادارے آ جاتے ہیں۔ ان میں انجمن ترقی اردو بھی شامل ہے جو اس وقت آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک شعبہ تھا، وہ اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔ اور ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۵ء تک اس عہدے پر

متمکن رہے۔ اس دوران اردو کے تعلق سے جو عملی خدمات انہوں نے انجام دیں ان کا ذکر باعث طوالت ہے۔

علامہ شبلی کہیں بھی رہے ہوں اور کچھ بھی کرتے رہے ہوں، ندوۃ العلماء ان کے ذہن سے کبھی دور نہیں رہا۔ وہ جہاں بھی رہے اس کے سالانہ اجلاسوں میں برابر شریک ہوتے رہے۔ ان کا خاص سروکار مدارس اسلامیہ کے نصاب سے بالعموم اور ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم سے بالخصوص رہا۔ ان کا خیال تھا اور صحیح خیال تھا کہ مدارس اسلامیہ میں عربی بطور ایک کلاسیکل زبان کے پڑھائی جاتی ہے، زیادہ توجہ صرف ونحو اور علوم عقلیہ پر رہتی ہے۔ جو علوم مقصود بالذات ہیں ان کی تدریس پر اتنا وقت صرف نہیں کیا جاتا ہے جتنا کرنا چاہیے۔

جب علامہ شبلی کو ۱۹۰۷ء میں پانوں کا حادثہ پیش آیا اس وقت وہ اعظم گڑھ میں شعر العجم کی تالیف میں مشغول تھے۔ یہ حادثہ شدید تھا۔ اس کی تفصیلات بالعموم معلوم ہیں۔ بعض اختلافات بھی رہے ہیں لیکن ہم ان تمام امور سے صرف نظر کر کے عرض یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اتنا بڑا حادثہ بھی ان کے عزائم میں مزاحم نہیں ہو سکا اور نہ ان کے تصنیفی کام میں خلل ڈال سکا۔ تھوڑی مدت تو وہ یقیناً فریش اور زیر علاج رہے۔ ۱۹۰۸ء سے پھر اپنے اسفار میں اور دیگر کاموں میں مشغول ہو گئے۔ علاوہ تصنیف وتالیف کے ندوہ ان کی خاص توجہ کا مرکز تھا ہی۔ اسی سال سرکار برطانیہ سے ان کا پچاس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا ہے، ادارے چلانے کے لیے حکومت وقت کا تعاون بہر حال ضروری ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس سے مقصد اصلی میں خلل نہ پڑے۔ ندوۃ العلماء سے حکومت کی بدگمانی کو دور کرنے کے لیے جو کدو کاوش کی گئی اس کی داستان طویل بھی ہے اور بدمزہ بھی۔ بس اتنا مان لیجیے کہ اس دور کی حریت پسندی بھی کتنے قیود میں جکڑی ہوئی تھی اور ان زعماء کو دل کھول کر داد دیجیے جنھوں نے ان قیود کو نہ صرف ڈھیلا کیا بلکہ توڑ پھینکا۔

معاملہ صرف سرکار کے شکوک کو رفع کرنے اور اس سے مالی امداد اور اعزاز حاصل کرنے کا نہیں تھا، اپنوں کی ریشہ دوانیوں اور الزام تراشیوں سے عہدہ برآ ہونے کا بھی تھا۔ اس کے علاوہ ندوۃ العلماء کی ہمہ جہت ترقی بھی ہمیشہ علامہ کے پیش نظر رہی اور اس کے سالانہ

اجلاسوں میں شرکت کر کے اس کی شہرت اور وقار میں اضافہ کرتے رہے۔ ندوۃ العلماء کے علاوہ دیگر تعلیمی اور ثقافتی اداروں سے بھی ان کا برابر واسطہ رہا اور ان کی بھلائی کے لیے سخنے وقدمے (شکست پا کے باوجود) کوشاں رہے۔ ایم- اے- او کالج سے عملی تعلق منقطع ہو جانے کے باوجود کالج کو یونیورسٹی بنانے کی کوششوں میں بھی دلچسپی لیتے رہے۔

علامہ شبلی نعمانی ۱۹۰۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد منتخب ہو گئے اور اس عہدے پر ۱۹۱۲ء تک فائز رہے، اب سے پہلے بھی انہیں یہ عہدہ پیش کیا گیا تھا لیکن وہ نہیں آ سکے تھے۔ اب امید تھی کہ انہیں اصلاح نصاب کا پورا موقع ملے گا لیکن ایسا نہیں ہو سکا کیونکہ بعض اکابر ندوۃ العلماء کا قدیم ذہن اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ تاہم آج ہمیں ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم اور طرز تدریس میں جو تازگی اور انفرادیت نظر آتی ہے اس کا آغاز سب سے زیادہ علامہ شبلی ہی کا مرہون منت ہے۔ ہم اس سلسلے کے بعض دیگر نوعیت کے اختلافات کی تفصیل میں نہیں جائیں گے۔ علامہ کی فکر جدید میں علی گڑھ کے اثر سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن غور طلب یہ امر ہے کہ ایک وقت آیا جب انہیں نصاب تعلیم میں انگریزی کی شمولیت کے معاملے میں علی گڑھ کے ایک نامور فرزند مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے رویے سے مایوسی ہوئی اور اس کا اظہار انہوں نے مولانا شروانی کے نام اپنے ایک خط میں کیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی روایت ہے کہ علامہ شبلی کے مستقل طور پر ندوہ تشریف لانے سے سب سے زیادہ خوشی طلبہ کو ہوئی تھی۔ علامہ نے وہاں آ کر سب سے پہلے توجہ بعض ہونہار طلبہ پر دی۔ استاد کا ایک بڑا وصف یہ ہوتا ہے کہ طالب علم میں جوہر جان پائے، تقریر، تحریر، تدریس اس کی خاص طور پر ہمت افزائی کرے اور اسے بروئے کار لانے میں تعاون دے۔ علامہ بلاشبہ جوہر شناس تھے۔ خود انہیں بھی جوہر شناس استاد ملے تھے اور علی گڑھ کا پیر جواں اس معاملے میں سب پر فوقیت رکھتا تھا۔ علامہ کے اثر پذیر ذہن نے ان سب سے فیض حاصل کیا اور پھر نہ صرف در بے بہا ہو کر چمکے بلکہ دوسرے کتنوں کو چمکایا۔ سید صاحب ہی کی ذات گرامی اس کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ نام اور بھی لیے جا سکتے ہیں لیکن تنگی وقت دامن گیر ہے۔ تاہم مولانا عبدالسلام ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی کا نام لینا ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بغیر یہ ''تثلیث''

مکمل نہیں ہوتی ہے۔ علامہ نے اپنے شاگردوں کی تربیت کے وہ سب ذرائع استعمال کیے جو ضروری تھے۔ سرائے میر ضلع عظم گڑھ کا اسلامیہ مدرسہ، مدرسۃ الاصلاح بھی ان کی عنایت اور توجہ سے محروم نہیں رہا۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ یہ مدرسہ بیک وقت علوم دینی اور جدید تعلیم کا جامع ہو۔ اپنے عزیز مولانا حمید الدین فراہی کو اس کی خدمت پر آمادہ کرنا بھی ان ہی کا کام تھا۔

مسلمانوں کے باہمی اختلافات کی کہانی بہت پرانی ہے۔ اس اختلاف کی بنیاد خلیفۂ ثالث سیدنا عثمان غنیؓ کی شہادت سے پڑی۔ پھر یہ اختلاف مختلف ممالک اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں پھیل گیا۔ ندوۃ العلماء اس سے کیسے دور رہ سکتا تھا، وہ بھی اس کی زد میں آیا اور افسوس کی بات یہ ہے کہ علامہ شبلی کو اس اختلاف یا سازش کا مرکز بنایا گیا۔ ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کیونکہ یہ داستان بہت تلخ ہے۔ تاہم یہ عرض کر دیں کہ ان اختلافات کا آغاز علامہ کے معتمد تعلیم مقرر ہونے کے ساتھ ہی ہو گیا تھا، طبائع کا اختلاف بھی اور اصول ونظریات کا اختلاف بھی۔ سب سے پہلے مولانا خلیل الرحمٰن سہارن پوری سے، جو اس وقت ندوہ کے عارضی ناظم تھے، متعدد معاملات میں ہوا۔ پھر مخالفین کی ایک جماعت بن گئی۔ یہ بات علامہ کے بعض مقلدین (مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی) نے بھی تسلیم کی ہے کہ علامہ شبلی مذہبی معاملات میں اپنے دوسرے معاصر علماء سے پیچھے تھے لیکن یہ ایسا الزام ہے جو کسی رہبر یا مصلح پر اسی وقت لگایا جاتا ہے جب اس کے کاموں میں رخنہ ڈالنا مقصود ہوتا ہے۔ اس الزام سے کون بچا ہے، سرسید، مولانا آزاد، علامہ اقبال؟ اور بات پچھلوں ہی کی نہیں، اگلوں کی بھی ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کو اپنے اقتصادی نظریات کی بنا پر گوشہ نشین ہونا پڑا تھا۔ علامہ شبلی ذکی الحس شخص تھے۔ انہوں نے اختلافات کی وجہ سے علی گڑھ کو چھوڑا تھا اور حیدرآباد کو بھی۔ وہ شاید ندوۃ العلماء کو پہلے ہی چھوڑ دیتے لیکن عام اساتذہ اور طلبہ میں ان کی مقبولیت اس درجہ تھی کہ وہ ان کے گلے کا ہار بن گئی۔ بالآخر ۱۹۱۲ء آتے آتے یہ اُبال اتنا بڑھ گیا کہ چھلک اٹھا یعنی علامہ نے ندوۃ العلماء سے رسمی تعلقات منقطع کر لیے۔ رسمی اس لیے کہ دلی تعلق بہرحال برقرار رہا۔ ۱۹۱۴ء میں، جب علامہ کی صحت بہت خراب تھی اور وہ اپنی زندگی کے آخری امور کی انجام دہی میں مشغول تھے، ندوۃ العلماء میں طلبہ نے بڑے پیمانے پر اسٹرائک کیا۔ اس اسٹرائک کے تعلق سے بھی علامہ کو بدنام کرنے کی

کوشش کی گئی لیکن انہوں نے بعض دیگر مسلم اکابر کے ساتھ مل کر مثبت رول ہی ادا کیا۔ مسلمانوں کے ایک خاص طبقے کا حربہ تکفیر ہوتا ہے، وہ علامہ پر بھی آزمایا گیا۔ اسٹرائک ختم ہونا تھا اور وہ ہوا لیکن علامہ شبلی کی وفات کے بعد۔

انھوں نے جو مذہبی خدمات انجام دیں ان میں وقف علی الاولاد کے سلسلے کی خدمات بہت اہم ہیں۔ بہت سے دوسرے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی اولیت کا مقام تو سرسید احمد خاں کو حاصل ہے۔ دوسرا نام سید امیر علی کا لیا جاسکتا ہے۔ اسے صحیح رخ پر لانے اور آگے بڑھانے میں علامہ شبلی کا حصہ گراں قدر ہے۔ حکومت برطانیہ اسے ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ پہلی کوشش یہ تھی کہ یہ ثابت کیا جائے کہ یہ مسلمانوں کا مذہبی مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں مسٹر محمد علی جناح کی خدمات کا اعتراف ضروری ہے جنھوں نے اس مسئلے کو سنٹرل کونسل میں پیش کیا لیکن چونکہ وہ علم دین سے واقف نہیں تھے اس لیے مسئلے کو صحیح طریقے سے پیش نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا علامہ کا اور ان کا اختلاف رہا۔

اب سب طرف سے مایوس ہونے کے بعد امراض کے نرغے میں علامہ شبلی نے وطن مالوف اعظم گڑھ میں سکونت اختیار کی۔ علامہ شبلی کے ذہن میں اپنے وطن اعظم گڑھ میں کئی تعلیمی اور عملی منصوبے تھے لیکن وطن سے باہر رہنے کی وجہ سے وہ انہیں پورا نہیں کر سکے تھے۔ مثلاً وہاں کا نیشنل اسکول، جو اب جارج اسکول ہو گیا تھا، سے علامہ کو شروع سے دلچسپی تھی۔ وہ اب روبہ زوال تھا اور صرف مڈل اسکول ہو کر رہ گیا تھا۔ وطن واپسی کے بعد انھوں نے ان منصوبوں کی تکمیل کی طرف توجہ مبذول کی۔ کالج کی ترقی کے لیے وہ کوشاں ضرور رہے اور مختلف تدبیریں کرتے رہے لیکن موت نے انھیں زیادہ مہلت نہیں دی۔ بہرحال ان کی یاد میں شبلی کالج کا سنگ بنیاد ان کے حبیب صمیم نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے ہاتھوں ۳۱/ مارچ ۱۹۴۰ء کو رکھا گیا۔ اب مدت سے یہ کالج ترقی کر کے نیشنل شبلی کالج کے نام سے ڈگری کالج کی حیثیت سے تعلیمی خدمت انجام دے رہا ہے۔

ان سب کے علاوہ وہ دارالمصنّفین کا خاکہ بنانے میں مشغول رہے۔ دارالمصنّفین کے بارے میں ہم پہلے ہی اظہار خیال کر چکے ہیں۔ علامہ نے اسلام، علم اور مسلمانوں کی جو

آخری خدمت انجام دی وہ سیرۃ النبیؐ کی تصنیف ہے۔ ابھی پہلا حصہ ختم کر کے دوسرے حصے تک پہنچے تھے کہ وقت موعود آ گیا اور ''یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا''۔ سیرۃ النبیؐ کی تکمیل کے لیے ان کی نظر تین مخلصین پر پڑی: مولانا حمید الدین فراہی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی، لیکن دارالمصنّفین کے خاکے میں رنگ بھرنے کی مانند اس کام کی تکمیل بھی قدرت نے سید صاحب ہی کے لیے طے کر دی تھی اور انہوں نے یہ خدمت نہایت حسن وخوبی سے انجام دی۔ تاہم جلد اول کا شمار، کیا بلحاظ متن اور کیا باعتبار زبان، علامہ کی شاہ کار تصانیف میں ہوتا ہے۔ اگر زندگی مکمل کرنے کی مہلت دیتی تو شاید ایسی چیز وجود میں آتی جو علامہ کی جملہ تصانیف میں سب سے اونچا مقام پاتی۔ آخر عمر میں اعظم گڑھ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد ان کے دو بڑے مشغلے تھے: سیرۃ النبیؐ اور دارالمصنّفین۔ لیکن اجل نے انھیں زیادہ مہلت نہ دی اور ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کی وفات ہوگئی۔ **اللھم اغفر وارحم وانت خیر الراحمین۔**

سیرت النبیؐ حصہ اول ودوم کا یادگار ایڈیشن

علامہ شبلی نعمانیؒ

شبلی صدی تقریبات کے موقع پر علامہ شبلی کی مایۂ ناز اور دارالمصنّفین کی قابل فخر پیش کش سیرۃ النبیؐ کو نہایت خوبصورت، نفیس ترین طباعت سے آراستہ کر کے خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا گیا، چنانچہ سیرۃ النبیؐ کی دونوں ابتدائی جلدیں دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع کی گئی ہیں، سردست یہ محدود تعداد میں ہیں لیکن یہ شبلی صدی تقریبات کی یادگار کے طور پر ہر صاحب ذوق کے لیے سرمایۂ چشم ودل ہیں۔

قیمت =/۲۰۰۰ روپے